میرا جی کے مطالعے کی حقیقی اساس کی تلاش

ڈاکٹر راشدہ قاضی/ڈاکٹر رانا غلام یٰسین

Abstract

Sanaullah Meera Ji (May 1912-Nov1949) was made a character of fiction because of his way of life and pen-name attributed to his unsuccessful love story. His sketch written by Manto (May 1912-Jan 1955) made his character more mysterious rather abnormal though he painted his innocence. In fact, he was a significant poet among giants of his time , representative of the anger and depression of younger generation trying to explore creative idiom for inner life. He was influenced by 20th century french poets. His sentimental poetry has sexual touch. But he gave his poetry an innovative colour, mixed with the desire of death and ecstasy of passion. Some psychological issues and habits should not become basis of studying w poetic idiom of Meera Ji.

علامہ اقبال (۱۹۳۸ء۔۱۸۷۷ء) کے بعد اُردو شاعری میں 4 بڑے شاعر طلوع ہوئے ۔میرا جی (۱۹۴۹ء۔۱۹۱۲ء)، ن م راشد (۱۹۷۵ء۔ ۱۹۱۰ء)،فیض احمد فیض (۱۹۸۴ء۔ ۱۹۱۱ء)، مجید امجد (۱۹۷۴ء۔ ۱۹۱۴ء)۔ یہ شعروسخن کی خوش قسمتی ہے کہ یہ 4 بڑے بطور شخص بھی انفرادیت کے حامل ہیں اوران کا رنگِ سخن بھی جداگانہ ہے اوران کے لسانی تصرفات اوراجتہادات بھی نمایاں طور پر جدا ہیں،لیکن کسی اور شاعر نے اپنے آپ کو ویسے پراسرار نہیں بنایا جیسے میرا جی نے اہتمام کیا۔وہ مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی جریدے ادبی دنیا سے وابستہ ہوئے تو ان کے تراجم (مشرق ومغرب کے نغمے)،ان کی عملی تنقید (اس نظم میں)اوراُن کی شاعری (گیت،نظمیں اور چند غزلیں) نے ان کیلئے مداحوں کا ایک بڑا سا حلقہ پیدا کر دیا۔اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک کی مخالف قوتوں،حلقۂ ارباب ذوق لاہوراور بعد میں محمد حسن عسکری اور شمس الرحمٰن فاروقی سے متاثر ایک حلقۂ ناقدین نے میرا جی کی داخلی حسّیت ، جمالیاتی احساس اور ہیئتی تجربوں پر بہت کچھ لکھا۔ملتان کے ایک جوانمرگ شاعر انوار انجم نے ایم اے کا ایک مبسوط مقالہ میرا جی کے بارے میں لکھا جو ۴۰۰ سے زائد صفحات کا تھا،مگر بعد کے برسوں میں پنجاب یونیورسٹی کے کتاب خانے سے اس مقالے کی کاپی غائب ہوگئی۔تاہم قیامِ پاکستان کے بعد بہت عرصے تک میرا جی

کی ہندی آمیز زبان، ارضی اساطیری حوالے اور خود تسکینی کے تجربے کی لذتیت درس گاہوں میں مطعون رہی مگر اشتراکی خطرے کے مقابلے میں یہ کم تر برائی سمجھی گئی۔اس لئے پنجاب یونیورسٹی نے ڈاکٹر رشید امجد کو بھی اجازت دی کہ وہ میراجی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھیں۔حال ہی میں آکسفورڈ پریس نے میراجی پر اُردو کے نئے نقاد اور محقق ڈاکٹر ناصر عباس نیئر کی کتاب شائع کی ہے،جس میں ڈاکٹر صاحب نے میراجی کی ابنارملٹی یا دیوانگی سے متعلق بہت سی حکایات کی بے جا اہمیت کو مسترد کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُس کے علمی اور تخلیقی تناظر کو نمایاں کیا ہے، جسے اس کے مطالعے کی بنیاد بننا چاہیئے۔اسی طرح بھارت کے معروف نقاد اور محقق ڈاکٹر شمیم حنفی نے ۲۰۰۸ء میں سنگ میل لاہور سے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے ''جدیدیت اور نئی شاعری'' کو شائع کرایا تو قارئین کو احساس ہوا کہ انہوں نے بھی اپنے موضوع کی مناسبت سے میراجی کی شاعری کو بہت اہم گردانا، تاہم اُردو کے معصوم طالبعلموں کے ذہن میں یہی نقش رہا کہ ثناء اللہ ایک دیوانہ تھا جسے ایک بنگالی لڑکی میرا سین نے مجنون کر دیا، حالانکہ میراجی کبھی اُس کے رُوبرو اظہارِ عشق نہ کر سکے اور نہ شاید اُس کو کبھی پتہ چل سکا کہ کوئی سایہ اُس کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے ایسا سایہ جس کا نام ثناء اللہ تھا جسے اُس نے اس تعاقب کے دوران ہی اُتار پھینکا ہے اور اب اُس کا نام میراجی ہے۔

منٹو کی ہر تحریر میں بے پناہ قوت ہے اور یہ بھی منٹو ہی تھا جس نے میراجی کا خاکہ لکھا جس میں اُس کے تین گولوں کا ذکر تھا۔گرمیوں، سردیوں میں اُس کے اوورکوٹ پہنے رہنے کا ذکر تھا اور غسل سے اس کی کدورت یا اجتناب کا بیان تھا مگر وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ ''میراجی کی فطرت بچوں کی طرح معصوم تھی''[۱].....اس دنیا میں جینے کیلئے مادی اور سماجی حوالے اور عملی ذہانت مطلوب ہے اس کا میراجی کی زندگی میں فقدان تھا۔اس لئے منٹو کے قبیلے ہی کے ایک فرد احمد بشیر نے لکھا ہے ''اس نے پوری زندگی انسانوں کے جنگل میں گذاری مگر خود ایک بے برگ و بار درخت بن کر کھڑا رہا''[۲].....''۳۸ برس کی عمر میں ہسپتال میں جواں سال موت۔۔۔جس کے اطراف صرف ہسپتال کا عملہ تھا، جنازے میں چند افراد تھے جن کی تعداد ۴ سے ۶ بتائی جاتی ہے۔وہ عام روش سے ہٹا ہوا غیر معمولی کردار کا حامل، باغی صفت، تجسس و تحیر کا جہانِ معنی ساتھ لئے ممنوعہ علاقوں کی ڈسکوری کرنے والا شاعر تھا''۔[۳]

اگرچہ میراجی نے تنقید کی دُنیا میں شاعر کے نام کو چھپا کر اُس کی نظم کو بغرض تنقید بنیادی حوالہ بنایا تھا۔(ادبی دُنیا) تاہم اسے تحقیق و تنقید کی ستم ظریفی سمجھنا چاہیے کہ ہم آج کسی شاعر کے سوانحی کوائف کے بغیر ایک قدم آگے نہیں چل سکتے، حتیٰ کہ اُس کے نفسیاتی مطالعے کیلئے بھی اس کے ماں باپ کے باہمی تعلقات، بہن بھائی، معاشی اور سماجی ماحول کو حوالہ خیال کیا جاتا ہے۔یہ بھی میراجی کی خوش قسمتی ہے کہ اُنہیں لاہور سے اچھے پرستار اور پارکھ ملے جن میں انیس ناگی، تبسم کاشمیری، ناصر عباس نیئر نمایاں ہیں۔ڈاکٹر انیس ناگی نے اُن کے سوانحی کوائف کی بھی چھان پھٹک کر کے یہ لکھا ہے۔''۲۵ مئی ۱۹۱۲ء کو لاہور کے محلّہ مزنگ میں ریلوے انجینئر منشی مہتاب کے گھر پیدا ہوئے۔گھر میں پہلے ہی بہت سے افراد تھے جہاں محمد ثناء اللہ ڈار کی آمد اہمیت کی حامل نہ تھی''۔[۴]

ثناء اللہ ڈار اپنے والد کے ساتھ سندھ، بلوچستان اور گجرات کاٹھیاواڑ میں مقیم رہے اور گجرات کاٹھیاواڑ

سے ہی میرا بائی کا بھی تعلق تھا۔ میٹرک کا امتحان پاس نہ کر سکے مگر یہ دلچسپ امر ہے کہ علم ڈگری کا محتاج کبھی نہیں رہا جو رقم ہاتھ میں آتی، کتابیں خریدتے، پنجاب پبلک لائبریری یا یونیورسٹی گراؤنڈ میں مطالعہ کرتے۔لباس کے معاملے میں لاپرواہ، صفائی اور نفاست سے کوسوں دور پابندیوں سے گریزاں یہ شخص جب ۱۳۔۱۴ سالہ بنگالی لڑکی میرا سین سے ملا تو بعض قصہ گوؤں کے مطابق 'پہلی ہی نظر میں دل ہار بیٹھا' اور پھر مضمون نگاروں نے اس طرح کی خیال انگیزی میں سہولت سمجھی کہ اپنی بے رخی سے میراجی کی تخیلی پیش قدمی کو میرا سین نے روک دیا، تب ثناءاللہ ڈار نے گلے میں مالا ڈالی، گھر چھوڑا، در بدر کی ٹھوکریں کھائیں۔اخبار میں چھپی میرا سین کی ایک تصویر کو خیال وخواب کا اثاثہ بنالیا، میرا سین کے نام خطوط لکھے لیکن اپنے پاس ہی محفوظ کر لیے۔ یہ دیوانگی بھرپور طریقے سے میراجی پر غالب آئی اور ثناءاللہ ڈار میراجی بن گئے۔کبھی دراز زلفیں، کبھی منڈا ہوا سر۔گھٹیا شراب میں ڈوبے ہوئے، رسمی تعلیم سے نالاں، خاندانی اتھارٹی کے خلاف جنسی کج روی پہ مائل جو کراہت کا باعث بنی۔اپنے آدرش اور جسم کے ساتھ چھُپن چھُپائی کھیلتے رہے، ناآسودہ خواہشیں، ناپسندیدہ رویوں کی نذر ہوئیں'۔۳۰ روپے سے ۱۵۰ روپے تک کی ملازمتیں ملیں مگر برقرار نہ رہیں۔ پان، تمباکو، سگریٹ اور شراب جیسے اشغال کا حامل یہ ناآسودہ شاعر ہمیشہ مقروض رہا۔ دہلی ریڈیو پر ملازمت کے دوران کچھ رقم والدہ کو بھی بھجواتے رہا۔ یہ پہلی اخلاقی ذمہ داری ہے جو میراجی نے پوری کی۔[۵]

بیشک سگمنڈ فرائیڈ کو بہت سے تخلیق کاروں کی تخلیقات سے مدد ملی کہ وہ تحلیلِ نفسی کے اُس نظریے یا پیمانے سے آشنا کر سکے جس نے بعد میں نفسیاتی دبستانِ تنقید کی بنیاد ڈالی۔اُردو کے مشہور نفسیاتی نقاد ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں: ''ایک ماہر نفسیات ہونے کی بنا پر فرائڈ کو انسان اس کے جذبات کی بھول بھلیوں اور سائیکی کے نہاں خانوں میں روشنی اور پرچھائیوں کے کھیل سے دلچسپی تھی اور یہ سب کچھ اعلیٰ تخلیقات میں ملتا ہے۔ادبیات کے مطالعہ میں فرائڈ کے نزدیک عصری ادوار بے معنی تھی۔ چنانچہ وہ بیک وقت سوفوکلیز شیکسپیئر گوئٹے اور دوستوفسکی سے متاثر تھا۔ان سے متاثر ہونے میں فرائڈ کیلئے ایک خاص نوع کی تحیر آمیز حسرت بھی تھی جو اس احساس سے جنم لیتی ہے کہ ہم نفسیات دان بلکہ زیادہ بہتر تو وہ خود ہی جس نفسی صداقت کا طویل تحقیقات اور اعصابی خلل کے مریضوں کی متنوع نفسی سرگزشتوں سے سراغ لگاتے ہیں اور پھر اسے اپنی دانست میں ایک نیا نظریہ منفرد تصور یا دریافت قرار دیتے ہیں۔تخلیق کار انسانی سائیکی کے بارے میں اپنے وجدانی مشاہدات الہامی قوت یا نفسی بصیرت کی بنا پر کہیں پہلے اپنی تخلیق میں اس کا اظہار کر چکا ہوتا ہے۔اس لئے وہ تمام عمر ادیبوں سے کسی حد تک مرعوب رہا یا ارنسٹ جونز کے الفاظ میں ان سے رشک کرتا رہا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فرائڈ کے شاگردوں یا مقلدین کے لئے ادب سے دلچسپی تحلیل نفسی کے نظریات کی شہادت میں مثالیں تلاش کرنے تک ہو سکتی ہے لیکن خود فرائڈ کا معاملہ اس کے برعکس تھا اور اس نے ہمیشہ ادب کا ایک قاری کی حیثیت سے مطالعہ کیا''[۶]

حقیقت یہ ہے کہ میراجی نے کلاسیکل شاعری سے نہ مصافحہ کیا اور نہ ہی ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے سیاسی منشور سے کچھ اکتساب کیا۔میراجی نے جنس کو کبھی پرائیویٹ جذبہ نہیں سمجھا وہ اس اندرونی طلسم کی وادی میں اتر کر کسی

معاون کے بغیر انکشاف کے مراحل طے کرتے رہے۔وہ اس پابند معاشرے میں جنس کی پکار بلکہ چیخ و پکار کا مظہر بنے ۔فرد کی جنسی جبلت معاشرتی قدغن سے آزاد ہو کر ان کے ہاں ہوشربا اسرار کا مرکز بنی اور یوں وہ وجودیت سے خود وجودیت کے مراحل طے کرتے ہوئے اک نئی دنیا بساتے ہیں جو مروج اصولوں سے انکار و انحراف کرتی ہے۔جنسی گھٹن مجبور معاشرے کی محرومیوں کا وسیلہ بنتی ہے۔چنانچہ اس جنون خیز صورتحال کا یہ صورت گر خود پر خواہش کا فیصلہ صادر کرتا ہے:

دور کرو پیراہن کے بندھن کو جسموں سے دوری حاصل کرو بندی خانے کے ان لمحوں سے
جن میں فطرت کو قیدی کر رکھا ہے تہذیبوں نے فطرت کا مذہب کیا ہے آزادی ہی آزادی
مرد ہو،عورت سے مل جاؤ،عورت ہو تو مردوں سے ذریعہ اور ہے معبود سے ملنے کا دنیا میں
میں جنسی کھیل کو کیوں تن آسانی سمجھتا ہوں[۷]

میراجی کو انسپریشن یا تحریک ایک طرف تو ہندو دیومالا نے دی اور دوسری طرف فرانس کے زوال پذیر اُن شاعروں کی تخلیقات میں جنہیں بعد کے زمانوں میں جدیدیت کی ابلیسیت کے مظاہر مانا گیا۔[۸]

تاہم یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ میراجی فرانسیسی علامت پسندوں کی طرح روایت کا باغی ہے۔وہ ذات کو شاعری کا محور بنا کر عورت کے دائمی قرب کی آرزو کرتا ہے۔مگر صرف فن کی حد تک ہی خود کو اور اس تشنہ تکمیل آرزو کو وقف کر دیتا ہے۔اس کا تخیل بے حد مضبوط ہے۔یہ خود اذیتی اور خود تلفی نفسیاتی الجھنوں کی عکاس ہے۔وہ صاحب مطالعہ تھے۔ایڈگر ایلن پو کے حالات سے متاثر تھے۔اس ضمن میں ان کا ایک طویل مضمون جو انہوں نے بودلیئر پہ لکھا،ان کی اپنی نفسیاتی الجھنوں کی وضاحت بھی کرتا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ بودلیر افیون اور شراب کے نشے میں دھت اپنی ماں سے غیر معمولی محبت کا حامل اور مجرد شخص ہے۔شاید اس لئے میراجی اس سے متاثر ہوئے۔دونوں کا معاشرتی، مذہبی اور عمرانی فرق اپنی جگہ لیکن مماثلت تجرد اور ماں سے محبت ہے۔[۹] یہ اور بات ہے کہ بودلیر ایک نفیس شخص تھا مگر میراجی کا نفاست سے دور دور تک کا کوئی تعلق نہ تھا۔اسی زمانے میں اختر شیرانی اور سلمٰی کا قصہ عروج پر تھا مگر ثناءاللہ ڈار نے تو عشق کا چولا پہن کر اپنی شناخت ہی بدل ڈالی۔اختر شیرانی کے گرد رومانی دھندلکا، بودلیر، دادا ازم کا حامی اور بناؤ سنگھار کا رسیا تھا۔جبکہ میراجی نے ۳ گولے تھام لئے۔یہ ۳ گولے گویا ان کی شناختی علامت بن گئے۔میراجی نے روایت سے بندھنا مناسب نہ سمجھا بلکہ وہ روایت کا بت توڑ کر نئے اسرار کے دھندلکے پیدا کئے اور ان سے حظ اٹھایا۔اس کے استعارے نرالے،اسکی تکنیک عجب،تمثالیں نئی اور روپ انوکھا ہے۔انہوں نے حقیقت کا پردہ چاک کر کے خود کو افسانہ بنا ڈالا اور پرفریب گھاٹیوں میں اتر گئے ان کے ہاں جذبے جرم نہ تھے۔

میراجی نے خود کہا ہے:''ادب شخصیتوں کا ترجمان ہے اور شخصیتیں زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ظاہر ہے آج کل ہماری زندگی ہر مہینے نہیں تو ہر برس ضرور بدلتی جا رہی ہے اور یوں نہ صرف اقتصادی اور سماجی حالات ادب پر اثر انداز ہو رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ذہنی طور پر خصوصاً مغرب سے آئے ہوئے خیالات جہاں ادب اور آرٹ میں فنکاری کے نئے اسلوب رائج کرنے کا باعث ہوئے ہیں وہاں اخلاقی لحاظ سے بھی روزمرہ کی

باتوں کو دیکھنے کا ایک نیا ڈھب آتا جا رہا ہے بلکہ آ چکا ہے''۔[۱۰]

ہمارے ہاں جدیدیت کا جب چرچا ہوا تو ہمارے ناقدین نے اس کے لئے جو تھیوری بنانی چاہی،اس کے لئے راشد اور میراجی کے کندھے زیادہ استعمال ہوئے،یہ تو کہیں بعد میں ہوا کہ شمیم حنفی جیسے متوازن نقاد نے لکھا:

''اس نقطے پر میراجی جدیدیت کی فکری رو سے کچھ دور بھی ہو جاتے ہیں۔ان کی نظر امکانات پر تھی اس لئے مستقبل کے خطروں کا ویسا شدید احساس ان کو نہیں تھا جو نئی شاعری میں خوابوں کی مکمل تباہی اور ابدی کے ثبات پر ایک غم آمیز یقین کے سبب واضح شکلوں میں رونما ہوا۔''[۱۱]

میراجی کی تمام شاعری کا ایک مرکزی نقطہ،اساسی جذبہ،بنیادی سوال ایک آرزو میں لپٹا ہوا ہے،ہر طرح کے کہرے،یخ بستگی اور ابہام کے باوجود اور وہ ہے وصل کی آرزو،موت سے نیستی سے وصال کی آرزو!اس نے خود الطاف گوہر کو لکھا تھا:

''ہست کی طرح نیست بھی محدود ہے کیونکہ نیست سے آگے کچھ نہیں۔کچھ بھی نہیں۔مختلف گھیروں کا یہ سفر جب ایک نقطہ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے جس کے آس پاس صرف ایک ہی دائرہ ہے تو وہ دائرہ بھی ایک نقطہ بن کر رہ جاتا ہے اور اس نقطے پر پہنچ کر یادیں ہی ایک سہارا ہوتی ہیں۔''[۱۲]

اور اس آرزو کی بہترین تجسیم اس کی نظم 'سمندر کا بلاوا' میں ہوئی ہے،اس کا ایک حصہ دیکھئے:

یہ پربت ہے خاموش ساکن
کبھی کوئی چشمہ اُبلتے ہوئے پوچھتا ہے کہ اس کی چٹانوں کے اس پار کیا ہے
مگر مجھ کو پربت کا دامن ہی کافی ہے دامن میں وادی ہے
وادی میں ندی ہے،ندی میں بہتی ہوئی ناؤ ہی آئینہ ہے
اسی آئینے میں ہر اک شکل نکھری مگر ایک پل میں جو مٹنے لگی ہے تو وہ پھر نہ اُبھری
یہ صحرا ہے.....پھیلا ہوا خشک بے برگ صحرا
بگولے یہاں تند بھوتوں کا عکس مجسم بنے ہیں
مگر میں تو دور.....ایک پیڑوں کے جھرمٹ پہ اپنی نگاہیں جمائے ہوئے ہوں

حوالہ جات:

۱۔ سعادت حسن منٹو،مضمون تین گولے،مشمولہ گنجے فرشتے،(لاہور:مکتبہ جدید،۱۹۶۵ء)
۲۔ احمد بشیر،اکیلا،میراجی،مشمولہ سویرا،لاہور،شمارہ۲۳
۳۔ انیس ناگی،ڈاکٹر،میرا جی ایک بھٹکا ہوا شاعر،(لاہور:پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۱ء)،ص:۱۵

۴۔ ایضاً،ص:۱۲
۵۔ ایضاً،ص:۱۳۔۱۵
۶۔ مغرب میں نفسیاتی تنقید،(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء)،ص:۲۰۔۲۱
۷۔ بحوالہ سلیم احمد،نئی نظم اور پورا آدمی،(کراچی:ادبی اکیڈمی،۱۹۶۲ء)
۸۔ تفصیل کے لیے دیکھئے،جمال پانی پتی کی کتاب جدیدیت اور جدیدیت کی ابلیسیت، (کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۰۵ء)
۹۔ میراجی،چارلس بودلیر،مشمولہ میرا جی ۔ ایک مطالعہ،مرتبہ:ڈاکٹر جمیل جالبی،ص:۵۱۔۵۸ سے ماخوذ ہے۔
۱۰۔ بحوالہ نئی شاعری کی بنیادیں،سوغات،بنگلور جدید نظم،ص:۱۶۲
۱۱۔ جدیدیت اور نئی شاعری،(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص:۴۵۲
۱۲۔ میراجی،مکتوب بنام الطاف گوہر،بحوالہ وزیر آغا،میرا جی کا عرفانِ ذات،(الٰہ آباد: شب خون،جولائی ۱۹۶۸ء)،ص:۴

مآخذ:

۱۔ انیس ناگی،ڈاکٹر،میرا جی ایک بھٹکا ہوا شاعر،لاہور:پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۱ء۔
۲۔ جمال پانی پتی،جدیدیت اور جدیدیت کی ابلیسیت،کراچی:اکادمی بازیافت، ۲۰۰۵ء۔
۳۔ سعادت حسن منٹو،مضمون تین گولے،مشمولہ گنجے فرشتے،لاہور:مکتبہ جدید،۱۹۶۵ء۔
۴۔ سلیم احمد،نئی نظم اور پورا آدمی،کراچی:ادبی اکیڈمی،۱۹۶۲ء۔
۵۔ میراجی،مکتوب بنام الطاف گوہر،بحوالہ وزیر آغا،میرا جی کا عرفانِ ذات،الٰہ آباد: شب خون،جولائی ۱۹۶۸ء۔

☆☆☆